دینی ریاست اور شہری ریاست

ڈاکٹر جاسم مہلہل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	دینی ریاست اور شہری ریاست
مولف	:	ڈاکٹر جاسم مہلہل
مترجم	:	شعبہ حسنین ندوی
صفحات	:	۲۳
قیمت	:	
سن طباعت	:	

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله و الصلاۃ و السلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم، أما بعد!

سیاسی مسائل اور زندگی سے متعلق نوازل جیسے موضوعات ایک طویل گفتگو کے متقاضی ہوتے ہیں، ایسے موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے ضروری ہوتا ہے کہ ان موضوعات سے متعلق تمام نقطہ ہائے نظر کا احاطہ کرلیا جائے۔ وزارت برائے اوقاف واسلامی امور کا یہ قدم قابل ستائش ہے کہ انہوں نے "**الاجتهاد بتحقيق المناط :فقه الواقع و التوقع**" کے عنوان پر یہ سمینار منعقد کروایا۔ نصوص شرعیہ کو معاصر حالات وواقعات پر منطبق کرنے، مستقبل کے حالات وواقعات کو جاننے کی کوشش کرنے اور نتائج پر نظر رکھنے کے عمل کو آج کے دور میں ''اجتماعی اجتہاد'' کا نام دینا ہی مناسب ہے۔ آج جس موضوع پر میں آپ کے سامنے گفتگو کرنے جارہا ہوں اس کا تعلق سیاست سے ہے، آج کے اس سمینار میں میری گفتگو کا موضوع ''دینی ریاست اور شہری ریاست'' ہے۔ اس موضوع سے متعلق بکھری ہوئی مختلف معلومات کو میں نے بے شمار کتابوں سے جمع کیا ہے، اس سلسلہ میں، میں نے انٹرنیٹ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ محدود وقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اس موضوع پر اختصار کے ساتھ مقالہ تحریر کیا ہے، اور چونکہ میرے سامعین ایسے علماء کرام ہیں جو اس موضوع اور اس کے متعلقہ موضوعات سے بخوبی واقف ہیں اس لئے بھی میں نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ میں نے اپنے اس مقالہ کو چار مسائل، چند اشکالات اور خلاصہ پر تقسیم کیا ہے، اور علماء کرام کی یہ بات اپنے پیش نظر رکھی ہے کہ اصل مقصد حق بات تک رسائی حاصل کرنا ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ بات کون کہہ رہا ہے۔ خداوند قدوس سے دعا گو ہوں کہ وہ مجھے اس موضوع پر گفتگو کرنے کے سلسلہ میں اپنی توفیق سے نوازے۔ ''عرب بہاریہ'' کے پس منظر میں اس مقالہ کا مقصد متعلقہ موضوع پر بحث ومناقشہ کو عام کرنا ہے۔

پہلا مسئلہ :

پہلا مسئلہ مقاصد شریعت سے متعلق ہے، مقاصد شریعت پر عمل کو یقینی بنانا ضروری ہے تا کہ علماء کے درمیان ہونے والے اختلافات کو کم کیا جا سکے اور ان کے متبعین کی ایسی تربیت کیے جا سکے کہ مسائل میں اختلاف کے وقت ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دینے میں وہ انصاف اور امانت داری سے کام لیں۔ مقاصد شریعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسائل اور ان کے احکام پر غور وفکر کرنے سے مسلکی تعصب سے نجات ملتی ہے اور حوادث ونوازل کے سلسلہ میں حق تک پہنچنے میں رہنمائی ملتی ہے۔ اگر ریاست کی ایک ایسی شکل کو یقینی بنایا جائے جس میں تمام مقاصد ضروریہ (دین، نفس، عقل، نسل، مال اور عزت وآبرو کی حفاظت) کی رعایت کی گئی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس ریاست میں حاجیاتی مقاصد کی رعایت نہیں کی گئی ہوگی، کیونکہ بقول امام شافعی حاجیاتی مقاصد کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کسی حکم میں وسعت پیدا کرنا اور تنگی و پریشانی کو دور کرنا مقصود ہوتا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں : ''کلیات میں شارع کا مقصود حرج وتنگی کو رفع کرنا ہے، لہذا آپ کوئی بھی ایسا شرعی کلیہ نہیں پائیں گے جس کا حکم بھی دیا گیا ہو اور اس میں کلی یا اکثری حرج پایا جاتا ہو، اور یہی اللہ کے اس قول کا تقاضا بھی ہے کہ ''**وما جعل علیکم فی الدین من حرج**''۔ لہذا اگر شرعی نصوص پر جزئی غور وفکر کیا جائے اور اس میں کلی مقاصد کی رعایت نہ کی جائے یا بعض اصولی دلائل سے ناقص استدلال کیا جائے اور اس سلسلہ میں ان امور کی رعایت نہ کی جائے جو جدید حالات وواقعات کے احکام کو جاننے میں مؤثر ہوتے ہیں تو اس کا نتیجہ صحیح حکم تک رسائی حاصل نہ کر سکنے کی شکل میں نکلتا ہے۔

دوسرا مسئلہ : بحث ومناقشہ کے دوران آنے والی اصطلاحات کی تعیین :

علماء سلف یہ کہا کرتے تھے کہ اگر کسی مسئلہ میں بحث ومناقشہ صرف بحث ومناقشہ

کی غرض سے کیا جائے یا کسی مسئلہ میں بہت زیادہ قیل وقال کیا جائے یا متعلقہ موضوع سے ہٹ کر کسی دوسرے موضوع پر وقت لگایا جائے تو اس عمل سے وقت ضائع ہوتا ہے اور دین کو بھی نقصان پہنچتا ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب اسلامی ریاست نے یونانیوں کے علوم سے استفادہ شروع کیا اور علم جدل، علم کلام اور علم منطق میں اس قدر غرق ہوگئی کہ یہ کہا جانے لگا کہ ''جو شخص منطق سے ناواقف ہے وہ عقل سے کورا ہے'' تو اس صورت حال کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کی پہچان اس امت کی نہیں رہ گئی جو مجاہد ہوتی ہے اور جو بھلائیوں کا حکم دیتی ہے اور برائیوں سے روکتی ہے۔ اسی زمانہ میں امام ابن تیمیہؒ کا ظہوار ہوا، انہوں نے اپنی کتاب نقض المنطق کے ذریعہ منطق کے بت کو لوگوں کے ذہنوں سے نکالا، انہوں نے اپنی اس کتاب میں گفتگو کے چند قواعد وضوابط متعین فرمائے، مثلاً انہوں نے کہا کہ بحث ومناقشہ کے دوران آنے والے الفاظ کی مراد اور مقصود مدمقابل سے معلوم کرلینا چاہئے، کیونکہ ایک ہی لفظ اور جملہ کے کئی مفاہیم ومعانی ہوسکتے ہیں، اگر مدمقابل کی زبان سے ادا ہونے والے لفظ کے کسی ایک معنی پر اتفاق نہ ہو تو اس صورت میں دو گفتگو کرنے والے ایک دوسرے کے مفہوم ومقصود کو بخوبی نہیں سمجھ پاتے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا مدمقابل بہت ہی چرب زبان اور چالاک ہو اور وہ گفتگو کے آغاز میں ہی آپ کو اپنی فکری واعتقادی جال میں پھنسا دے۔ امام ابن تیمیہؒ جب اپنے مخالفین سے گفتگو کرتے تو وہ بحث شروع کرنے سے پہلے اپنے مدمقابل سے الفاظ کے معانی ومفہوم کو پوچھ لیتے، مثلاً امام ابن تیمیہؒ اپنی کتاب ''الرسالۃ التدمیریۃ'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''اگر کوئی یہ کہے کہ اسماء وصفات سے متعلق ظاہری نصوص مراد ہیں یا ظاہری نصوص مراد نہیں ہیں، تو اس شخص سے یہ کہا جائے گا کہ لفظ ''ظاہری'' میں اجمال اور اشتراک ہے، اس کے بعد بحث ومناقشہ کا آغاز کیا جائے گا اور اسماء وصفات کی نفی کرنے والے کے مراد ومقصود کی تردید کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ کیا اللہ کسی جہت میں ہے، تو ہم سوال کرنے

والے سے پوچھیں کہ ''جہت'' سے تمہاری مراد کیا ہے؟ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی آسمان میں ہے، تو ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالی کسی جہت میں نہیں ہے، لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنی مخلوقات سے اوپر اور ماوراء ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ بات درست ہے''۔

شہری ریاست اور دینی ریاست کے تعلق سے گفتگو کے ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ مندرجہ ذیل چند امور سے واقف ہو جائیں:

الف — ریاست کے اجزاء ترکیبی اور اس کی بنیادیں:

۱— عوام۔

۲— وہ جغرافیائی علاقہ، جس میں عوام رہائش اختیار کرتے ہیں۔

۳— وہ اقتدار جس میں امر و نہی کا اختیار حاصل ہو، اور یہ ایسی سیادت وحکمرانی ہے جس سے عوام خوش ہوں، خواہ سیادت فطری قانون کی ہو یا عوام کے ارادہ کی ہو یا بین الاقوامی قانون کی ہو۔

ب — دینی ریاست:

وہ ریاست جس کی قیادت کی باگ ڈور علماء دین کے ہاتھ میں ہو، جیسا کہ یوروپ کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔

ج — شہری ریاست:

ایسی ریاست جس کی قیادت ایسے انسان کرتے ہیں جن کا تعلق عوام سے ہی ہوتا ہے۔ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ''دنیاوی امور ومعاملات میں انسان ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں، کیونکہ ہر انسان فطری طور پر شہری واقع ہوا ہے جس کی ضرورتیں اپنے جیسے انسانوں کے تعاون سے ہی پوری ہوتی ہیں، منفعت کے حصول اور مضرت کو دفع کرنے میں

انسان ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں، ان کے درمیان پایا جانے والا اختلاف ہی ان کو باہمی تعاون پر آمادہ کرتا ہے''۔ امام ابن تیمیہؒ کا یہ قول علامہ ابن خلدون کے اس قول سے مختلف نہیں ہے کہ ''انسانی اجتماع بہت ضروری ہے''۔ علماء سلف کی کتابوں میں پایا جانے والا یہ عمومی معنی آج بھی سیاسی مراجع کی کتابوں میں اپنی اسی عمومیت کے ساتھ پایا جاتا ہے، حتی کہ غیر مسلم مصنفین نے بھی اس عمومی معنی کو برقرار رکھا ہے، لہٰذا مصری قبطی مفکر رفیق حقیقی ''شہری ریاست'' کے تعلق سے لکھتا ہے : ''شہری ریاست ایک غیر فوجی اور غیر پولیس ریاست ہوتی ہے، لفظ ''شہری'' کے اس سے زیادہ کچھ اور معنی نہیں ہیں''۔ ''شہری ریاست'' کے مفہوم کی اصطلاحی وعلمی تعیین نہ ہونے کے سبب ہی بہت سارے مسلم مفکرین وریسرچ اسکالرس اسے ''علمانی وسیکولر ریاست'' کے ہم معنی قرار دیتے ہیں، اس مفہوم کو شہری ریاست کے ایک داعی جناب جابر عصفور نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں : ''اگر ہم اصطلاح شہری ریاست کا استعمال کریں اور اس سے مراد ''علمانی ریاست'' لیں، جیسا کہ ترکوں نے کیا تھا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے''۔

آج کے دور میں امت مسلمہ کا المیہ یہ ہے کہ وہ فکری وثقافتی سطح پر مغرب پرستی کا شکار ہے، جس کی وجہ سے امت مسلمہ کی اپنی شناخت کو کافی زک پہنچا ہے اور جس کی وجہ سے عالم عرب وعالم اسلام میں مغربی مفکر جان جاک روسو کے افکار خصوصاً ''عوام کی حاکمیت'' سے متعلق فکر کو قبول عام حاصل ہو رہا ہے۔ ''عوام کی حاکمیت'' سے متعلق روسو کی فکر کا مشہور ماہر قانون جناب عبدالرزاق السنہوری نے شیخ محمد رشید رضا کی تحریروں کی روشنی میں اپنی کتاب ''الخلافہ'' میں مواخذہ کیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں : ''شہری معاشرتی سیاست کی بنیاد اسلام نے رکھی ہے، اور امت کے لئے یہ گنجائش رکھی کہ وہ اس میں اجتہاد کرسکیں، کیونکہ شہری معاشرتی سیاست زمان ومکان کے تبدیل ہونے سے تبدیل ہوجاتی ہے، اسی طرح آبادی میں اضافہ

کے ساتھ ساتھ اس میں ترقی بھی ہوتی رہتی ہے، شہری معاشرتی سیاست کی بنیاد یہ ہے کہ امت کا اقتدار واختیار اسے ہی حاصل ہوتا ہے، اس کے تمام امور شوری کے ذریعہ طے پاتے ہیں، اس کی حکومت جمہوریت ہی کی ایک شکل ہوتی ہے، اس حکومت میں خلیفہ پر بھی احکام اسی طرح مرتب ہوتے ہیں جس طرح عوام کے ایک کمزورترین شخص پر، خلیفہ کی حیثیت شریعت کے احکام اور امت کی آراء کو نافذ کرنے والے شخص کی ہوتی ہے''۔

اس کے بعد آپ رعایا اور حاکم کے درمیان تعلقات اور حاکم کے انتخاب کے طریقوں پر ایک طویل گفتگو فرماتے ہیں، اور پھر ایک نہایت اہم ضابطہ بیان فرماتے ہیں جس پر عرب واسلامی حکومتیں عمل پیرا ہیں، آپ کہتے ہیں : ''امت کا اقتدار واختیار قومیت پر مبنی نہیں ہے، جیسا کہ ترکی میں بعض افراد اس زمانہ میں قومی عصبیت پر مبنی حاکمیت کی طرف دعوت دیتے تھے۔ اسی طرح امت کا اقتدار واختیار شریعت سے ماوراء نہیں ہے، بلکہ وہ شریعت کے تابع ہے''۔

تیسرا مسئلہ: حکومت میں حاکمیت اور سیادت:

دینی اور شہری ریاست کے تعلق سے گفتگو کرنے کے وقت اللہ کی حاکمیت اور امت کے اقتدار واختیار کے تعلق سے اشکال کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر مشہور اسلامی مفکر جناب عبد القادر عودہؒ کی کتاب ''الاسلام وأوضاعنا السیاسۃ'' کا مطالعہ کافی مفید ثابت ہوگا، اس کتاب میں آپ نے شیخ رشید رضا کی رائے کی مزید وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، اس کتاب میں جہاں انہوں نے ایک طرف امت کے اقتدار واختیار کو بیان کیا ہے وہیں دوسری طرف انہوں نے وضعی قوانین کو باطل قرار دیا ہے اور شریعت سازی میں انسان کی مکمل آزادی کو بھی غلط ٹھہرایا ہے۔ ان کے بعد سید قطب شہیدؒ نے اپنے ادبی قلم کا سہارا لے کر حاکمیت کے مفہوم کو بیان کیا، آپ کا خیال ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کو ہی حاصل ہے، آپ نے اپنی اس فکر

کو اپنی تمام کتابوں کی بنیاد قرار دیا ہے، اور اسی فکر کی خاطر آپ نے اپنی زندگی قربان کردی۔ آپ نے اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں سورہ یوسف کی آیت نمبر ۴۰ "**إن الحكم إلا لله أمر ألا تعبدوا إلا إياه ذلك الدين القيم ولكن أكثر الناس لا يعلمون**" (سورہ یوسف: ۴۰) کی جو تفسیر بیان کی ہے اسے پڑھ کر حاکمیت کی پوری شکل ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ سید قطب شہیدؒ کے یہاں حاکمیت سے مراد صرف تشریعی اختیار نہیں ہے، آپ اس کا مفہوم شریعت سازی سے کہیں وسیع سمجھتے ہیں، آپ کے نزدیک حاکمیت کے مفہوم میں تصورات، مناہج، اقدار و عادات اور تقالید و روایات سبھی شامل ہیں۔ اس طرح آپ نے یہ فرق بھی بیان کیا ہے کہ اقتدار و اختیار کا مصدر صرف اللہ تعالی کی ذات ہے، لیکن اقتدار و اختیار کو برتنے کا حق انسان کو حاصل ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں: "اسلامی نظام حکومت میں امت ہی حاکم کا انتخاب کرتی ہے اور اسے اللہ کی شریعت کے مطابق حکمرانی کرنے کا اختیار دیتی ہے، لیکن امت حاکمیت کا مصدر نہیں ہے جو قانون کو مشروع کرتی ہے، حاکمیت کا مصدر تو صرف اللہ ہی ہے"۔

اس اصل کو امام مودودیؒ نے بھی اس وقت ذکر کیا تھا جب پاکستان ہندوستان سے علاحدہ ہوا تھا، آپ نے ایک شہری ریاست کا پروجیکٹ پیش کیا تھا، اسی طرح جب ترک سے خلافت کا خاتمہ ہوا تھا تو ترکی نے مغربی وسیکولر مفہوم میں ایک "شہری ریاست" قائم کرنے کا اعلان کیا تھا، اس موضوع سے متعلق سید قطب شہیدؒ اور مولانا ابوالاعلی مودودیؒ کے افکار و آراء سے جہاں فکر اسلامی کے بعض افراد نے اتفاق کیا ہے وہیں ان میں سے بعض افراد نے ان کے ان افکار و نظریات پر اعتراض بھی کیا ہے۔ اس پس منظر میں علامہ حسن الہضیبیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے حاکمیت اور تکفیر کے موضوع کی وضاحت کرنے کے لئے کتابیں تحریر کیں۔

اس مسئلہ میں ایک وضاحت جناب عباس محمود العقاد کی جانب سے بھی کی گئی ہے، ان کی یہ وضاحت پاکستانی حکومت کے ایک وزیر جناب اشتیاق قریشی کی فکر پر مبنی ہے، آپ کا

خیال ہے کہ ''عوام کی سیادت'' درحقیقت ''الٰہی سیادت'' کے فکر سے متعارض نہیں ہے۔ شیخ علال الفاسی اس موضوع کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حقیقی سیادت تو صرف اللہ کو ہی حاصل ہے، یعنی اوامر ونواہی میں صرف اللہ کی جانب ہی رجوع کیا جائے گا، لیکن جہاں تک عملی سیادت کا تعلق ہے تو اس کا سرچشمہ عوام ہیں، بشرطیکہ امت کا اقتدار واختیار شریعت اسلامی کے اصولوں سے ہم آہنگ ہو۔

اس موضوع پر غور وفکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اختلاف کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

۱ — درحقیقت ہم نے ''حاکمیت'' کا وہ معنی جو ''قومیت'' اور ''قوانین کے وضع کرنے'' پر مبنی ہے، کو دوسری زبانوں اور ثقافتوں سے درآمد کیا ہے، اور پھر اسے اپنے شرعی مفردات پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغلوب قوم کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ غالب قوم کی اقتداء کرے، علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں فرماتے ہیں: ''مغلوب قوم کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ وہ غالب قوم کے لباس اور دیگر تمام امور میں اس کی اقتداء کرنے کی کوشش کرتی ہے، کیونکہ نفس انسانی یہ سمجھتا ہے کہ جو غالب ہے وہ ہر ناحیہ سے کامل ہے، لہذا وہ اس کے اقتداء پر آمادہ رہتی ہے''۔ اسی پس منظر کی وجہ سے بعض حضرات اس لفظ کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق کھلواڑ کرتے ہیں، جیسا کہ خوارج نے معرکۂ صفین میں حضرت علی بن ابی طالبؓ کے ذریعہ استعمال کردہ اصطلاح ''تحکیم'' پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ **''لا حكم إلا لله''**، درحقیقت یہ بات تو اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھی، لیکن اس کے ذریعہ سے جو کہنا مقصود تھا وہ بالکل درست نہیں تھا۔

۲ — لفظ Theocracy کے مفہوم کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی گئی، اس لفظ سے ''علماء ورجال دین کی حکومت'' مراد لیا جاتا ہے، یہ مفہوم درحقیقت حکومت کے سلسلہ میں توریت میں وارد یہودی مفہوم سے ماخوذ ہے۔ عصور وسطی میں یوروپ میں کنیسہ کا دین کے نام پر مکمل

تسلط ہو گیا تھا۔ انہی وجوہات کی بنا پر یوروپ کی سیکولر تحریکات نے اس بات پر اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں کہ دین اور سیاست کو علاحدہ علاحدہ رکھا جائے، ان کا کہنا تھا کہ دین کا تعلق صرف عبادت گاہوں سے ہے، پارلیمنٹ سے اس کا کچھ بھی لینا دینا نہیں، شاید اسی تلبیس کا شکار جناب خالد محمد خالد بھی ہو گئے تھے، لہٰذا انہوں نے اپنی کتاب "من هنا تبدأ" میں یوروپ کی دینی حکومت اور اسلامی حکومت کے درمیان خلط ملط کر دیا، بعد میں آپ نے اپنے اس خیال سے رجوع کر لیا تھا۔

۳- سیکولر فکر سے تعلق رکھنے والے افراد یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ "شہری ریاست" درحقیقت "لادینی وسیکولر ریاست" کا ہی بدل ہے جو کہ مغرب میں بھی ناکام ہو چکا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ یہ تاثر بھی دیتے ہیں کہ "شہری ریاست" میں اصطلاح "ڈیموکریسی" کی مثبت باتیں شامل ہیں نہ کہ منفی باتیں، اس طرح انہوں نے اس اصطلاح کی کوئی متعین تعریف نہیں کی، بلکہ اسے ایک معجون مرکب بنا دیا، تاکہ مغرب زدہ افراد اور سیکولر افراد تمام اقدار سے کھلواڑ کر سکیں، ربانی والہی پروجیکٹ کی ہر طرح سے مخالفت کر سکیں اور دین واسلامی شریعت سازی کو مختلف وسائل اور بہانوں کے ذریعہ زندگی سے علاحدہ کر سکیں۔ مغرب کے غلبہ کی یہ ایک نئی شکل ہے۔

چوتھا مسئلہ: اسلامی ریاست، واجب اور ممکن کے درمیان:

"اسلامی ریاست" سے ہماری مراد وہ ریاست ہے جسے اللہ کی شریعت کنٹرول کرتی ہے، جس میں حدود اللہ قائم کئے جاتے ہیں، جس میں دین کے شعائر نافذ کئے جاتے ہیں، جس میں لوگوں کو اسلام کے عدل اور ایمان کی سلامتی کی خوشخبری دی جاتی ہے اور جس میں لوگوں کے دین، جان، مال، عزت وآبرو اور عقل محفوظ ہوتی ہے۔ "واجب ریاست" سے ہماری مراد وہ ریاست ہے جس میں دین کے تمام شعائر (یعنی عقیدہ، شریعت، نبوی اخلاق اور خلفاء راشدین

کی سنتوں) پر عمل کرنا ضروری ہو۔ ''ممکن ریاست'' سے ہماری مراد وہ ریاست ہے جس میں ان تمام باتوں پر عمل کو ممکن بنایا جائے جن پر عمل کرنا ممکن ہو، اس سلسلہ میں تمام ممکنہ کوششیں صرف کردی جائیں اوراس میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کی جائے۔

مندرجہ بالا باتوں کے پیش نظر مندرجہ ذیل باتوں پر عمل کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں:

الف—سب سے پہلے مرحلہ میں اسلامی ریاست کو ممکنہ حدتک قائم کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ اس کے ذریعہ سے واجب ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہو سکے، اس ممکن اسلامی ریاست کے نتائج سے غفلت نہ برتی جائے اور نہ ہی حالات وواقعات کے تعلق سے مغالطہ انگیزی اورفریب سے کام لیا جائے، ساتھ ہی حقیقی دنیا اور امکانی دنیا میں تمیز بھی کی جائے۔

ب—یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام پسندوں کے درمیان یکجہتی وہم آہنگی پیدا کی جائے، تاکہ وہ ''ممکن اسلامی ریاست'' کے قیام کے سلسلہ میں مشترک بنیادوں پر متفق ہوسکیں، او راس طرح ممکن ریاست کے ذریعہ واجب ریاست کی راہ ہموار ہو سکے۔

ج—اسلام پسند افراد، دعاۃ اور اسلامی حکومتوں کے درمیان اختلاف کی خلیج کو کم کیا جائے اور اتفاق کے دائرہ کو وسیع تر کیا جائے، تاکہ اسلام پسند حلقہ ناکافی سے محفوظ رہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**وأطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا إن اللہ مع الصابرین**'' (سورہ انفال:۴۶)۔

د—واجب اور ممکن ریاست کے سلسلہ میں غوروفکر کے دوران قواعد فقہیہ میں سیاسی طور پر غوروفکر کرنا ضروری ہے، مثلاً:

ا—مشقت آسانی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے ''**المشقۃ تجلب التیسیر**''، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب میں تم لوگوں کو کسی چیز سے روک دوں تو اس سے باز رہو، اور جب میں تم لوگوں کو کسی کام کے کرنے کا حکم دوں تو اپنی استطاعت بھر اسے انجام دینے کی کوشش کرو'' (بخاری)۔

۲– سہولت تنگی و پریشانی کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتی (**المیسور لا یسقط بالمعسور**)، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر ایسا نہیں کرسکتے تو بیٹھ کر پڑھو، اور اگر ایسا بھی نہیں کرسکتے ہو تو لیٹ کر پہلو کے بل نماز پڑھو'' (بخاری)۔

۳– عز بن عبدالسلامؒ فرماتے ہیں کہ موجود کی حفاظت مفقود کو حاصل کرنے سے زیادہ بہتر ہے، اسی طرح مشقت کو دور کرنا منفعت کو حاصل کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ ان ہی فقہی قواعد کے مماثل یہ قواعد فقہیہ بھی ہیں مفاسد کو دور کرنا منافع کو حاصل کرنے سے زیادہ بہتر ہے، شدید ترین ضرر کو کم سے کم ضرر سے زائل کیا جائے گا، دو شر میں جو سب سے آسان شر ہو اور دو ضرر میں سے جو سب سے ہلکا ضرر ہو اسی کو اختیار کیا جائے گا۔

۴– امام شاطبیؒ نے مقاصد ضروریہ اور حاجیاتی مقاصد پر عمل کرنے کی اہمیت کے سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے ان پر بھی غور وفکر کرنا چاہئے۔

موضوع بحث سے متعلق چند اشکالات:

اول: اسلامی تحریکات میں سیاسی عمل کا مقام:

تحریک اسلامی کے آغاز سے آج تک یہ لفظی وکلامی بحث جاری ہے کہ دعوت اسلامی میں سیاست کا کیا مقام ہے، یہ بحث خود اسلام پسندوں کے درمیان بھی ہو رہی ہے اور دوسری جانب اسلام پسندوں اور سیکولرزم کے حامیوں کے درمیان بھی جاری ہے۔ خود تحریک اسلامی میں پیچیدگی پائے جانے کے سبب اس طرح کا اشکال سامنے آرہا ہے، دراصل تحریک اسلامی کے معاشرتی ڈھانچہ اور اجتماعی شعور میں دینی وفکری دونوں ہی سرمایہ پایا جاتا ہے، اسی طرح تحریک اسلامی کے معاشرتی ڈھانچہ واجتماعی شعور میں اسلامی تاریخ اپنے سیاسی ومعاشرتی ابعاد کے ساتھ پائی جاتی ہے، اور ساتھ ہی مستقبل کے تعلق سے بہت سارے خواب اور تمنائیں بھی تحریک اسلامی کا حصہ ہیں۔ اس پیچیدگی کے سبب یہ شکل سامنے آرہی ہے کہ ''اسلامی عمل''

کا آغاز کیسے کیا جائے، اس سلسلہ میں بہت سارے سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں، مثلاً :

اسلامی عمل کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟ بلندی و چوٹی سے یا بنیاد سے؟ عوام سے یا حکومت سے؟ کیا سیاسی عمل ہی اصلاح کی کنجی ہے؟ یا عوامی دینی عمل؟ یا دونوں ہی؟ اور اگر دونوں کو یکجا کرنا ضروری ہے تو مزاحمت اور موازنہ کے وقت کسے ترجیح دی جائے گی؟ اسی اشکال کے سبب ''اسلامی ریاست'' کی اصطلاح کے سلسلہ میں مختلف تحریکات اسلامی کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، بعض تحریکات اسلامی ''اسلامی ریاست'' کو اقامت دین کا ''ہدف'' قرار دیتی ہیں، جبکہ بعض اسلامی تحریکات اسے اقامت دین کا ''وسیلہ'' قرار دیتی ہیں، اور بعض تحریکات اسلامی اسے اقامتِ دین کا ''نتیجہ'' قرار دیتی ہیں، ان کے نزدیک نہ ہی یہ ''ہدف'' ہے اور نہ ہی ''وسیلہ''۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن واجبات ومحرمات کے سلسلہ میں صرف سنت واحادیث نے شریعت سازی کا کام انجام دیا ہے ان کا تعلق اصول اور کلیات سے نہیں ہے، بلکہ ان کا تعلق قرآن میں وارد شریعت کے فروع وجزئیات سے ہے، ایسے امور جن کے سلسلہ میں قرآن واحادیث خاموش ہیں اور جن کے تعلق سے اجتہاد کیا گیا ہے ان کا تعلق شریعت سازی کے تیسرے درجہ سے ہے، ایسے امور کو ''تیسرا درجہ'' اس لئے نہیں دیا گیا ہے کہ یہ اجتہادی امور ومسائل ہیں، بلکہ انہیں تیسرا درجہ شارع کے قصد وارادہ کے پیش نظر دیا گیا ہے، علماء اصول فقہ کے مطابق سکوت وخاموشی بھی شریعت سازی کا ایک حصہ ہے، علماء اصول فقہ کا بیان ہے : ''ضرورت کے وقت خاموشی اختیار کرنا ایک طرح کا بیان ہے''۔

اس سے بھی آگے درجہ کی بات امام ابواسحاق شاطبیؒ نے ترتیب کے قاعدہ کے سلسلہ میں کہی ہے، ان کا خیال ہے کہ فہم کے سلسلہ میں مدنی سورتوں کو مکی سورتوں سے مقدم رکھنا چاہئے۔

اسی لئے اصولی دلالتوں کو قوت کے اعتبار سے ترتیب دیا جاتا ہے، لہذا ''عبارت کے معنی ومفہوم'' کو اشارہ کے معنی ومفہوم'' سے مقدم رکھا جائے گا، کیونکہ جو بات بولی جارہی ہے

(منطوق) وہ سمجھنے والی عبات (مفہوم) سے بہتر ہے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ تعارض کے وقت ترجیحی قاعدہ یہ ہے کہ ''صراحت کے سامنے دلالت کا کوئی اعتبار نہیں''۔ اس قاعدہ کی روشنی میں یہ بات جاننے کی ہے کہ دعوت الی اللہ اور اصلاح کا کام نطق کے ذریعہ واجب (واجب بالمنطوق) ہے، لہذا اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، البتہ جہاں تک دعوت کے وسائل اور طریقوں کا تعلق ہے تو ان کا تعلق ''اشارہ'' سے ہے۔

جہاں تک دستوری وانتظامی سطح پر ریاست کے عمومی امور کے انتظام وانصرام کا تعلق ہے (جسے قدیم تصنیفات میں ''سلطانی احکام'' یا ''شرعی سیاست'' کا نام دیا گیا ہے) تو اس کا تعلق شریعت سازی کے تیسرے درجہ سے ہے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ زیادہ تر تشریعی قوانین جو کہ ریاست کی تعمیر کی بنیاد ہیں، قرآن وحدیث اور اجتہاد میں موجود ہیں۔ انہیں ہم شریعت سازی کی بنیاد کہہ سکتے ہیں جو ریاست اور معاشرہ کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس میں خاص قوانین اور عمومی قوانین دونوں ہی شامل ہیں، ان خصوصی وعمومی قوانین کے سلسلہ میں قرآن وحدیث کے تفصیلی واجمالی نصوص بھی وارد ہیں۔ عمومی قوانین کی مثالیں یہ ہیں: سزائیں اور ان کی مقدار، مالی قانون، بین الاقوامی قانون اور جنگ وامن کے احکام سے متعلق قانون۔ خصوصی قوانین کی مثالیں یہ ہیں: شہری وتجارتی قانون اور کام کرنے سے متعلق قانون۔ فقہ اسلامی سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرنے والے کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ ان کتابوں میں عبادات، عادات اور معاملات کے بہت سارے مسائل سے متعلق تشریع کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جبکہ ''امامت کبری'' (جسے موجودہ دور میں ''دستوری قانون'' کہا جاتا ہے)، خلافت اور خلیفہ سے متعلق امور، اور ریاست کے ڈھانچہ اور شکل کے تعلق سے ہدایات قرآن، حدیث اور فقہی اجتہاد ہر جگہ بہت قلیل مقدار میں اور اشارات وکنایات کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ امامت کبری کے موضوع پر تصنیفات کا آغاز اجتہاد کے دور کے شروع ہونے کے بعد ہی ہوا ہے،

اس بات کو علامہ یوسف القرضاوی نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''السیاسۃ الشرعیۃ میں بیان کیا گیا ہے، اس موضوع پر لکھی گئی قدیم ترین تصنیفات کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں:

- الاحکام السلطانیہ للماوردی (متوفی:۴۵۰ھ)
- الاحکام السلطانیہ لأبی یعلی الفراء الحنبلی (متوفی:۴۵۸ھ)
- غیاث الأمم لإمام الحرمین أبی المعالی الجوینی (متوفی:۴۷۶ھ)
- السیاسۃ الشرعیۃ فی إصلاح الراعی والرعیۃ لشیخ الإسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ (متوفی:۷۲۸ھ)
- الطرق الحکمیۃ فی إصلاح الراعی والرعیۃ لابن القیم الجوزیہ (متوفی:۷۵۱ھ)
- کتاب تحریر الاحکام فی تدبیر أہل الاسلام لابن جماعہ (متوفی:۷۴۹ھ)
- کتاب معید النعم ومبید النقم لتاج الدین عبدالوہاب بن السبکی (متوفی:۷۷۱ھ)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ریاست کی کلیات بیان کردی گئی ہیں، البتہ ریاست کی تفصیلات کو اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں سب سے زیادہ اختلاف سیاسی فقہ کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے، زمانۂ قدیم میں بھی اسی وجہ سے اسلام میں بہت سارے فرقوں اور مذاہب ومسالک کا وجود سامنے آیا تھا، امام شہرستانی تحریر فرماتے ہیں کہ امت کے درمیان سب سے زیادہ اختلاف امامت کے مسئلہ میں پایا جاتا ہے، اسلام میں کسی بھی دینی قاعدہ کے سلسلہ میں اس طرح تلواریں نہیں اٹھی ہیں جس طرح کے امامت کے مسئلہ پر اٹھی ہیں، البتہ یہ سارے واقعات تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ہی پیش آئے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ میں سے کسی کی بھی خلافت کے سلسلہ میں تلواریں نہیں اٹھائی گئیں، نہ ہی ان کے ادوار میں مسلمانوں کے درمیان اختلافات پائے جاتے تھے، اور نہ ہی دین کے کسی مسئلہ پر ان کے

درمیان تلواریں اٹھی تھیں۔

دوسرا اشکال: اقتدار کی پر امن منتقلی وتداول۔

تیسرا اشکال: سیاسی تعدد۔

چوتھا اشکال: سیاسی اختلاف

پانچواں اشکال: اسلامی ریاست میں شہریت، ذمی اور اہل جزیہ۔

خلاصۂ کلام:

متعلقہ موضوع کو چار مسائل اور ایک اشکال کی صورت میں اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے بعد میں ذیل میں خلاصۂ کلام پیش کر رہا ہوں ء

اول: اسلام کی ابتداء سے اب تک کے سارے حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات سے عہد نبوت کا خاتمہ ہوا، اس کے بعد خلافت راشدہ علی منہاج النبوۃ کا دور آیا، اور یہ دور بھی حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ ختم ہو گیا، اس کے بعد سخت وجابر بادشاہوں کی ملوکیت کا دور آیا، اور یہ سارے مراحل خلافت عثمانیہ کے سقوط کے ساتھ ختم ہو گئے، ترکی نے خلافت عثمانیہ کے سقوط کا اعلان کیا اور اس کی جگہ پر ترکی میں ایک سیکولر ریاست قائم کی، پھر پہلی عالمی جنگ اور تحریک مستشرقین کا آغاز ہوا، پہلی جنگ عظیم میں اتحادی ممالک کامیاب ہوئے، اور Sykes-Picat معاہدہ کے تحت عالم اسلام وعالم عرب تقسیم ہو گیا، اس کے بعد استعمار سے آزادی کا مطالبہ کرنے والی تحریکات کا وجود سامنے آیا، تاکہ ریاست جدید شکل اختیار کر سکے، یعنی اس کے پاس ایک جغرافیائی علاقہ ہو جسے وہ وطن کہہ سکے اور اس میں رہنے والے لوگ ہوں جنہیں عوام کہا جا سکے اور ان عوام کے پاس ایسے دستاویز ہوں جن کے ذریعہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکیں، ساتھ ہی اقتدار کو ایک

ادارہ کی شکل دی جائے جسے ریاست اور حکومت کا نام دیا جائے اور جس کے کچھ حقوق اور واجبات ہوں، اس کے بعد وہ عالمی نظام کا حصہ بن جائے اور تمام بین الاقوامی دستاویزات، معاہدات، اور قوانین کی پابند ہوجائے، تا کہ ایک ریاست واسٹیٹ کے قائم ہونے اور ''خلافت راشدہ علی منہاج النبوۃ'' سے قبل کے مرحلہ کے نظام کے قائم ہونے کا اعلان کیا جا سکے، یہ وہ مرحلہ ہے جس کی خبر نبی کریم ﷺ نے اسلامی ریاست کے مختلف مراحل کو بیان کرتے ہوئے سب سے اخیر میں دی تھی، یہ مرحلہ قیامت کے قریب آنے کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔

جدید ریاست کے بہت سارے نام اور اس کی بہت ساری شکلیں ہیں، یہ جدید ریاست ''خلافت علی منہاج النبوۃ'' کی ریاست سے اتنی ہی دور ہے جس قدر دوری اس نے اپنے دستور، قوانین اور نظام زندگی میں اسلامی منہج سے اختیار کر رکھی ہے۔ یہ ایک ایسی جدید ریاست ہے جو منہاج النبوۃ سے تھوڑی بہت قریب ہے، لہذا وہ ''ممکن ریاست'' میں شامل ہے، ساتھ ہی یہ ریاست منہاج النبوۃ سے دور بھی ہے اور ایک سیکولر ریاست ہے، اس کے عوام عبادت کرتے ہیں اور دینی شعائر پر عمل کرتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ ریاست آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس اور عرب لیگ کا بھی حصہ ہے، کیونکہ اس ریاست کی اکثریت مسلمان ہے اور اس میں اصل حکومت اسلام کی ہے۔

دوم: اصطلاح ''دینی ریاست'' کے سلسلہ میں ہونے والے بحث ومناقشہ کا انکار کرنا چاہئے، کیونکہ اسلامی سیاسی منصوبہ کی ایک ایسے دین کی حیثیت سے اپنی الگ خصوصیات ہیں جس کے اپنے مراجع ہیں اور اپنی تاریخ ہے، اگر گفتگو ہونی ہی ہے تو جدید اسلامی ریاست اور سیکولر ریاست کے درمیان ہونی چاہئے۔

سوم: ایک حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ امت کس طرح کے سیاسی امور سے دوچار ہوگی، اللہ کے نبی ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''تکون النبوۃ فیکم ما شاء اللہ أن تکون،

ثم یرفعها إذا یشاء أن یرفعها، ثم تکون خلافة علی منهاج النبوۃ، فتکون ما شاء اللہ أن تکون، ثم یرفعها إذا شاء أن یرفعها، ثم تکون ملکاً عاضّا، فیکون ماشاء اللہ أن یکون، ثم یرفعها إذا شاء اللہ أن یرفعها، ثم تکون ملکاً جبریاً، فتکون ما شاء اللہ أن تکون، ثم یرفعها إذا شاء أن یرفعها، ثم تکون خلافة علی منهاج النبوۃ، ثم سکت'' (امام البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے)۔

مندرجہ بالا حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سخت ملوکیت (الملک العاض) اور ظالم وجابر ملوکیت (الملک الجبری) دونوں ہی خلافت کے مفہوم میں شامل ہیں، البتہ دونوں خلافت کے مفہوم میں اتنا ہی شامل ہیں جتنا ان دونوں کے اندر منہاج نبوت کا التزام پایا جاتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے تحریر فرمایا ہے : ''خلافت میں ملوکیت کو ملانا ہماری شریعت میں جائز ہے، ملوکیت عدالت کے منافی نہیں ہے، لیکن صرف خلافت (جس میں ملوکیت کا شائبہ نہ ہو) ہی افضل اور بہتر ہے''۔ قاضی ابوبکر بن العربی (متوفی: ۵۴۳ھ) فرماتے ہیں : ''ولایت میں مراتب اس طرح ہیں: سب سے پہلے خلافت پھر ملوکیت، خلافت کی ولایت چارلوگوں کو حاصل تھی۔ملوکیت کی ولایت حضرت معاویہؓ سے شروع ہوتی ہے، اللہ تعالی نے حضرت داؤدؑ (جو کہ حضرت معاویہؓ سے کہیں بہتر تھے) کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''**وآتاہ اللہ الحکم والنبوۃ**'' اللہ تعالی نے نبوت کو ملوکیت قرار دیا ہے''۔ علامہ ابن خلدونؒ فرماتے ہیں : ''یہ بات جان لو کہ اللہ تعالی نے بذات خود ملوکیت کی مذمت نہیں کی ہے، ملوکیت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، اللہ تعالی نے تو ان مفاسد کی مذمت کی ہے جو ملوکیت کے نتیجہ میں سامنے آتے ہیں، مثلاً ظلم وزیادتی، اور مفاد پرستی''۔

چہارم: اس بات پر اجماع ہے کہ اسلام نام ہے دین اور ریاست کا۔ رسول اللہ ﷺ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ ریاست کے حاکم اور امیر تھے، البتہ نبی کریم ﷺ نے خود

کے لئے ''اللہ کا بندہ اور نبی'' ہونے کے درجہ کو اختیار کر رکھا تھا، اسی لئے آپ ﷺ نے کبھی بھی ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا، کیونکہ یہ بادشاہوں کا شیوہ تھا۔ انہی وجوہات کی بناء پر خلافت کو ایک ایسا مقام اور درجہ دیا گیا جس پر صرف وہی شخص فائز ہوسکتا ہے جو دین اور اخلاق کے لحاظ سے کامل ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے :**"إن أكرمكم عند الله أتقاكم"** (سورہ حجرات ۱۳:)، نبی کریم ﷺ نے نبوت کے ساتھ ساتھ عبودیت کے جس درجہ ومقام کو خود کے لئے اختیار کیا تھا اس کی وضاحت اس حدیث میں ملتی ہے :**"إن العلماء ورثة الأنبياء، وإن الأنبياء لم يورثوا ديناراً ولا درهما، إنما ورثوا العلم فمن أخذه أخذ بحظ وافر"**۔ اسی وجہ سے امام ماوردیؒ نے امامت کی تعریف اس طرح کی ہے : ''امامت کونبوت کی خلافت کے طور پر وضع کیا گیا ہے، تا کہ اس کے ذریعہ سے دین کی حفاظت کی جا سکے اور دنیا کے معاملات کا انتظام وانصرام کیا جا سکے''۔ درحقیقت خلافت اسلامی نظام حکومت کے اہم صفات وخصائص میں سے ایک ہے، کیونکہ خلافت اس امت میں انبیاء کے مقام کو باقی رکھتی ہے، بایں طور کہ خلفاء ہی اس امت میں انبیاء کے قائم مقام ہیں۔ اس فکر میں کم سے کم اشتباہ وابہام ہے، علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں : ''شرعی خلافت میں بہت کم اشتباہ وابہام ہے، خلافت کے اسی مقام ومرتبہ کی وجہ سے ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ فقہاء نے خلافت کے مسئلہ کو عقائد میں شامل کر دیا ہے، حالانکہ اہل سنت کے نزدیک خلافت کا تعلق عقائد سے نہیں ہے، فقہاء نے یہ اس لئے کیا ہے، تا کہ خلافت کو لغو باتوں اور جدل ومناقشہ سے محفوظ رکھا جا سکے اور امت کے اتحاد واجتماعیت کی حفاظت کی جا سکے''۔ موضوع امامت اور اسے عقائد میں شامل کرنے پر امام الحرمین الجوینی نے اپنی کتاب ''غیاث الامم'' میں بہت تفصیل کے ساتھ رد کیا ہے۔

پنجم: خلافت کے موضوع پر گفتگو ''ممکن'' کے دائرہ میں کرنی چاہئے، اور یہ کوشش کرنی چاہئے کہ ان مبادیات وعناصر کو یقینی بنایا جائے جن پر اسلامی حکومت قائم ہوتی ہے،

ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ ''شریعت سازی کا سرچشمہ شریعت ہی ہے''۔

وہ مبادیات وعناصر جنہیں یقینی بنانے کی ضرورت ہے مندرجہ ذیل ہیں:

۱ــ عدل: علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں : ''رسولوں کی بعثت اور کتابوں کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ لوگ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے تعلق سے انصاف سے کام لیں''۔

۲ــ حق: اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **''وممن خلقنا أمة يهدون بالحق وبه يعدلون''** (سورہ اعراف ۱۸۱:)۔

۲ــ شوری: اللہ تعالی فرماتا ہے: **''وأمرهم شورى بينهم''** (سورہ شوری ۳۸:)، ایک دوسری جگہ پر فرماتا ہے : **''وشاورهم في الأمر''** (آل عمران ۱۵۹:)۔

۴ــ اخلاق: جس کسی معاشرہ میں بھی اخلاق حسنہ عام ہوجاتے ہیں وہاں شریعت اسلامی کی پیروی کی جانے لگتی ہے۔

۵ــ فروغ وترقی: فروغ وترقی کی خاطر محنت ومشقت کرنا۔

۶ــ ارادہ، آزادی اور حقوق: اسی وجہ سے اسلام نے سبھی کو پیدائش سے ہی آزاد قرار دیا ہے۔

☆ ☆ ☆